ڈاکٹر امین اللہ وثیر

کویت کی ادبی محفلیں

اگرچہ کویت ایک مستقل ریاست کے طور پر بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں وجود میں آچکا تھا۔ لیکن آج سے پچاس ساٹھ سال پیشتر تک خلیج فارس کے اس خطے پر جو اب تیل کی دولت کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے، مکمل علمی و ادبی جمود و طاری تھا۔ موجودہ حکمران خاندان آلِ صباح میں سب سے پہلے ہمیں شیخ احمد بن جابر کے عہد میں علمی و ادبی آثار کا پتہ چلتا ہے۔ شیخ احمد نے رجب ۱۳۴۹ھ میں کویت کی زمامِ امارت سنبھالی۔ اور علم و ادب کی نشوونما کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ اس سے پہلے کویت میں علمی و ادبی حرکت کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ اس وقت تک یہاں کے لوگ محض فقہ، عربی لغت اور حساب کے مبادیات سے واقفیت حاصل کرنے پر ہی اکتفا کیا کرتے تھے، عصری علوم و فنون اور جدید افکار و نظریات کا یہاں گزر نہیں تھا۔ بلکہ اس کے برعکس قدیم اصنافِ علم سے تجاوز کرنے کو الحاد و زندقہ خیال کیا جاتا تھا۔۔۔ غالباً اس کا سبب بلادِ متمدنہ سے دُوری اور اہلِ علم و فکر سے عدمِ اختلاط تھا۔

شیخ احمد بن جابر کی علمی سرپرستی

آلِ صباح کے بعض دوسرے حکمرانوں اور افرادِ خاندان کو بھی علم و ادب سے دلچسپی رہی ہے، لیکن کویت کی علمی تاریخ میں شیخ احمد بن جابر کا نام ایک مربی کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ شیخ کو اخبارات و رسائل کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ عراق اور دوسرے عرب ممالک سے شائع ہونے والے اخبارات باقاعدہ منگواتے تھے اور غالباً اسی مطالعے نے انھیں اپنی ریاست میں علم و فن اور ادبیات کی ترقی کی طرف متوجہ کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد انھوں نے انگلستان کا دورہ بھی کیا۔ اور برطانوی پارلیمنٹ کے ایک اجلاس کی کارروائی کا مشاہدہ کیا۔ وطن واپس آتے ہوئے وہ کچھ دنوں کے لیے مصر میں بھی ٹھہرے۔ لندن جانے سے پیشتر شیخ نے بمبئی کی سیر بھی کی تھی۔

وہ ایک روشن خیال حکمران تھے اور ان کا دورِ امارت کویت میں تعلیم و تعلم کی نشوونما اور ترقی کی طرف ایک اہم قدم قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ علم و ادب کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھوں نے اپنے زمانے میں ایک مجلسِ مشاورت بھی قائم کی، جس کے ارکان کی حیثیت سے اہلِ علم و فضل لوگوں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ شیخ احمد نے بہت سے مدارس بھی قائم کیے، جن میں مدرسہ احمدیہ بہت مشہور ہے۔ ۱۳۳۱ھ میں اس کی افتتاحی تقریب بڑی شان و شوکت سے منائی گئی اور ایک شاندار جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مدرسے کے سب سے پہلے مہتمم الاستاذ الشیخ یوسف عیسی الجناعی مقرر ہوئے۔ اور ان کے علاوہ چار علما پر مشتمل ایک مجلسِ منتظمہ بنائی گئی۔ المکتبۃ الاھلیۃ اور المنادی الادبی (ادبی مجلس) بھی شیخ احمد بن جابر کے دور کی علمی و ادبی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ کویت میں اشاعتِ علم کے سلسلے میں ان اداروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ شیخ احمد کی اس علمی دلچسپی کا یہ نتیجہ نکلا کہ کویت میں علمی زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ نوجوان نسل نے تحصیلِ علم کی خاطر وطن سے باہر جانا بھی شروع کر دیا اور بہت سے کویتی طلبا بغداد اور عراق کے دوسرے علمی مراکز کا رخ کرنے لگے۔

اس وقت کویت میں علمی و ادبی تحریک پورے شباب پر ہے۔ نئے نئے ادارے قائم کیے جا رہے ہیں۔ اور ایک عظیم الشان یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں لایا جا چکا ہے۔ اب کویت کے باشندے اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں کہ موجودہ دور، ارتقا اور تقدم کا دور ہے۔ جمود و تاخر کا نہیں۔ اب دنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکے گی جس کی رگوں میں تازہ خون رواں دواں ہوگا اور جو اپنے افراد میں جذبۂ مقاومت کو زندہ رکھ سکے گی۔ چنانچہ اہلِ کویت اب ہمت و جرأت کے ساتھ ترقی کی راہوں پہ گامزن ہیں اور ان کے قدم دورِ جدید کے علوم و فنون کے حصول کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ فکری تحریک ہمیں کویت کے شاندار مستقبل کی خبر دیتی ہے۔

علمی و فکری انقلاب کے محرکات

کویت کے اس علمی و فکری انقلاب کا جائزہ لیا جائے تو حسبِ ذیل اہم عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔

ا۔ جرائد و رسائل — آج کی دنیا میں افکار و نظریات کی تشکیل میں اخبارات اور سیاسی و غیر سیاسی مجلے اور جرائد زبردست کردار ادا کرتے ہیں۔ کویت ہی کا ایک شاعر احمد بن بشر الرومی کہتا ہے:

اِنَّ للصُّحفِ بقلبی   مَنزلاً اعلیٰ منزلہ

کویت کی ادبی محفلیں

انما الصحف کطیرٍ　　یشتهی الحرُّ هدیلهٗ
کلُّ مَن شاءَ رُقیاً　　صیّرَ الصحفَ سبیلهٗ
فبها خیرُ حیاةٍ　　وهی للعلمِ وسیلهٗ

ترجمہ: میرے دل میں اخبارات کی بڑی قدر ہے۔ اخبارات پرندے کی طرح ہیں۔ آزاد آدمی اس کے نغمہ کا شائق ہوتا ہے۔ جو شخص بھی ترقی کرنا چاہتا ہے، وہ اخبارات کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ان ہی کے ذریعہ زندگی کی بہتری ممکن ہے اور یہی علم و فضل کا ذریعہ ہیں۔

کویت میں سب سے پہلے جس خاندان نے اخبارات و رسائل کے مطالعہ کی طرف توجہ کی، وہ آلِ خالد تھے۔ یہ خاندان اس ریاست میں علمی و ادبی تحریک کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس اہلِ فضل گھرانے کے لوگوں میں حمد الخالد، احمد الفہد، ہلال بن حمد، خالد بن زید وغیرہم بہت مشہور ہیں۔ کویت میں مطالعہ کا ذوق و شوق اس خاندان کے باعلم افراد نے پیدا کیا۔ یہ لوگ اس زمانے میں بھی مشہور عالم اور مفسر قرآن سید رشید رضا کے رسالے "المنار" اور قاہرہ کے روزنامہ "المؤید" کے خریدار تھے، جب کویت کے عوام میں اخبارات اور ادبی رسائل کا پڑھنا کسی جرم سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ب۔ وہ حریت پرور افکار و نظریات جنھیں اہلِ علم و فضل اس سرزمین میں پھیلاتے رہے۔ ان بزرگ علماء میں سے بہت سے وہ بھی تھے، جو دوسرے عرب ممالک سے وقتاً فوقتاً کویت میں آتے۔ ان لوگوں نے بے شمار دقتوں اور رکاوٹوں کے باوجود اپنی تعلیمات اور جاندار افکار کو کویت میں پھیلایا اور اس طرح علم کے خلاف جو جاہلانہ تعصب اور اذہان و قلوب پر جو جمود طاری تھا، اسے ختم کرنے کی جد و جہد میں حصہ لیا، اور علم و فضل کے بیج بو دیے۔

اس سلسلے میں سید رشید رضا، الشیخ محمد الشنقیطی اور حافظ وہبہ مصری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ الشنقیطی ۱۳۳۲ھ میں الجمعیۃ الخیریہ کی دعوت پر کویت آئے اور وعظ و ارشاد کے ذریعے اپنے نظریات کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔ انھوں نے جمعیۃ کے زیرِ اہتمام منعقدہ کئی مجالس سے خطاب کرنے کے علاوہ مساجد کے اجتماعات میں بھی حصہ لیا اور اپنی پرزور خطابت سے عوام کے دلوں پر چھا گئے۔ وہ دوسری مرتبہ ۱۳۴۳ھ میں کویت

آئے۔ النادی الادبی نے ان کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا، جس میں کویت کی علمی تحریک کے سلسلے میں ان کی خدمات کو سراہا گیا۔

حافظ وہبہ کافی عرصہ تک المدرسۃ المبارکیہ اور پھر المدرسۃ الاحمدیہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کویت کے لوگ آج تک ان کے علم و فضل کے معترف اور ان کی علمی خدمات کے لیے ان کے ممنون ہیں۔

تونس کے مشہور عالم اور سیاسی رہنما شیخ عبدالعزیز الثعلبی کا نام کویت کے علمی و فکری انقلاب کے سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔ شیخ عبدالعزیز ۱۳۴۳ھ میں کویت آئے۔ وہ ایک زبردست خطیب اور محقق استاد بھی تھے۔ انھوں نے اس سرزمین میں زندگی کی روح پھونک دی اور بڑے چھوٹے سب کے سر ان کی علمی فضیلت کے سامنے جھک گئے۔

ج۔ فکری اور علمی انقلاب برپا کرنے میں ریاست کی جوان نسل نے بھی بہت اہم کردار کیا ہے۔ ان نوجوانوں نے وطن کی عظمت اور سربلندی کی خاطر شب و روز کام کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے المکتبۃ الاہلیہ اور النادی الادبی کی بنیاد رکھی۔ اخبارات و رسائل میں مضامین لکھ کر اہلِ وطن کے قلوب و اذہان پر دستک دی اور بالآخر علم و ادب کے زور سے جہالت و ظلمت کا خاتمہ کر دیا۔

علمی و ادبی ادارے

بعض علمی اداروں نے خصوصاً المدرسۃ المبارکیہ اور المدرسۃ الاحمدیہ نے علم کی روشنی کو دور دور تک پھیلانے میں بڑا کام کیا۔ یہ دونوں ادارے گویا ٹھنڈے اور شیریں پانی کے چشمے تھے، جن سے اہلِ کویت اپنی مدتوں کی پیاسی روحوں کو سیراب کرتے رہے۔ ان درس گاہوں کے افق سے علم و ادب اور حریتِ فکر و رائے کی شعاعیں بلند ہوئیں جو سارے کویت کو منور کر گئیں۔ ان کے قیام سے پہلے یہاں جغرافیہ، تاریخ اور سائنس کے مضامین کا پڑھنا پڑھانا گویا حرام کے درجے میں تھا اور صرف چند قدیم اصنافِ علم کا حصول اور وہ بھی چند اربابِ شریعت تک محدود ہوا کرتا تھا۔

مدرسۂ مبارکیہ

اس مدرسہ کی بنیاد ۱۳۲۹ھ میں رکھی گئی۔ اگلے سال اس میں تعلیم و تدریس کا آغاز ہوا۔ اس مدرسے کی تاسیس میں کویت کی تین بزرگ شخصیتوں، شیخ یوسف بن عیسیٰ، شیخ ناصر المبارک اور سید ایسین طباطبائی نے بڑی جد و جہد کی اور عوام کو اس کے لیے دل کھول کر عطیات دینے کی رغبت دلائی آلِ خالد نے اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس مدرسے کو کویت کے حاکم الشیخ مبارک آل الصباح کے نام سے منسوب کیا گیا۔

مدرسۂ احمدیہ

یہ مدرسہ ۱۳۴۰ھ میں قائم کیا گیا۔ اس کی تاسیس میں بھی ریاست کے اہلِ علم و فضل اور اہلِ خیر نے بڑی تگ و دو کی اور حاکمِ کویت شیخ احمد الجابر نے اس میں خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا۔ مدرسے کے افتتاح کے موقع پر کویت میں ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا، جس سے استاذ عبداللہ خلف، مشہور ادیب سلطان آلِ ابراہیم الکلیب اور سید حسین بن کمال النجفی جیسے فضلا نے خطاب کیا۔ سید حسین النجفی نے اس موقع پر ایک نظم بھی پڑھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

أرض الكويت الا ازدهي	فلقد نجحت بما رجوت
بشراك في ابنائك الـ	غر بفضلهم نجحت
هم شيدوا الله معهدًا	للعلم فيه قد سموت

ترجمہ:۔ اے سرزمینِ کویت! تو خوش ہو کہ تو اپنے مقصد میں کامیاب و کامران رہی ہے۔ تجھے مبارک ہو، تیرے وہ فرزند جن کے علم و فضل کی بنا پر تو نے کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے تیرے لیے ایک ایسی تعلیم گاہ کی تعمیر کی ہے جس کی وجہ سے تو سربلند ہو گی۔

۱۳۴۳ھ میں کویت کے ایک مخیر تاجر شملان بن علی آلِ سیف نے مدرسۃ السعادہ کے نام سے ایک اور علمی ادارے کی بنیاد رکھی۔ یہ مخیر تاجر تنہا اس درس گاہ کے اخراجات کا ذمہ دار تھا۔ اس ادارے میں کویت کے بہت سے یتیم اور نادار بچوں کی تربیت اور تدریس کا عمدہ انتظام کیا گیا تھا علاوہ ازیں بانی کے اپنے خاندان کے بچے بھی یہیں تعلیم پاتے تھے۔ کویت کے ایک فاضل شاعر استاذ یوسف بن عیسیٰ نے ایک قصیدے میں اس درس گاہ اور اس کے بانی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

الجمعیۃ الخیریہ

یہ رفاہی انجمن ہے جو ۱۳۳۱ھ میں کویت کے ایک مخلص اور صالح نوجوان فرحان الفہد الخالد کی انتھک کوشش کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ اس انجمن کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ تھا کہ کویت کے نوجوانوں کو اسلامی ممالک کی بلند پایہ یونیورسٹیوں میں تحصیلِ علم کے لیے وظائف دے کر بھیجا جائے۔ الجمعیۃ الخیریہ نے الشیخ محمد الشنقیطی سے وعظ و تعلیم کے لیے درخواست کی اور فقراء و مساکین کے علاج کی غرض سے ایک ترک ڈاکٹر اسعد آفندی کی خدمات حاصل کیں۔ جمعیۃ، غریب و نادار مسلمانوں کی تجہیز و تکفین کا بندوبست بھی کرتی تھی۔ اس کی تبلیغی مساعی سے بہت سے یہودی اور عیسائی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

جمعیۃ کے بانی فرحان الفہد، ایک سال بعد بمبئی سے کویت واپس آتے ہوئے بحری جہاز میں انتقال کر گئے اور انھیں بندر عباس میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد الجمعیۃ الخیریہ سیاسی وجوہ کی بنا پر ختم کر دی گئی۔

المکتبۃ الاہلیہ

کویت کے اہلِ علم و ادب کی مدت سے خواہش تھی کہ ایک ایسی لائبریری قائم کی جائے جو علمی سرچشمے کا کام دے۔ اہل کویت کی یہ تمنا شیخ یوسف بن عیسیٰ القناعی اور ان جیسے دوسرے مخلص علما کے ذریعے پوری ہو گئی۔ ۱۳۴۱ھ میں المکتبۃ الاہلیہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور شائقینِ علم و ادب کے لیے اس کے دروازے کھول دیے گئے۔ یہ لائبریری ان بہت سی مفید کتابوں کی وارث بنی جو الجمعیۃ الخیریہ کی ملکیت تھیں۔ اور اب تک آلِ بدر کے مکان میں محفوظ تھیں۔ لائبریری کے لیے ایک مجلسِ منتظمہ کا انتخاب کیا گیا، جس کے رئیس شیخ یوسف القناعی اور مہتمم الفاضل سلطان آل ابراہیم الکلیب تھے۔

النادی الادبی

یہ ادبی انجمن کویت کے چند پرجوش نوجوان ادیبوں اور شاعروں نے ۱۳۴۲ھ میں قائم کی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا ادارہ وجود میں لایا جائے، جہاں بیٹھ کر نوجوان طبقہ تبادلۂ خیالات کرے اور جس میں جدید فکری و ادبی رجحانات کے بارے میں باہمی گفتگو کی جائے۔ النادی الادبی کے پروگرام میں تہذیبِ اخلاق، ادبیات کی نشر و اشاعت اور مفید لکچروں کا انتظام کرنا شامل تھا۔ یہ نظریہ سب سے پہلے

مشہور ادیب خالد بن سلیمان السعدسانی سنے پیش کیا اور دلدادگانِ ادب وشعر نے اسے پذیرائی بخشی۔ النادی الادبی کے صدر کویت کے جانے پہچانے ادیب شیخ عبداللہ الجابر مقرر ہوئے، جو حکمران خاندان کے فرد تھے۔ انجمن کے سکریٹری عیسیٰ بن صالح الجماعی اور خزانچی محمد بن احمد الغانم تھے۔ اس کے ارکان کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ اس انجمن نے اپنے عہدہ داروں اور نوجوان ارکان کی زیر سرپرستی کویت میں مختلف اصنافِ ادب کی ترویج کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور انجمن نے ایک شاندار لائبریری بھی قائم کی۔ ماضیٔ قریب تک کویت میں ادبیات کا میدان اس قدر وسیع نہیں تھا کہ وہ دوسرے عرب ممالک کا مقابلہ کرسکتا۔ لیکن صفحاتِ بالا میں جن علمی و ادبی اداروں کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس خطۂ عرب میں بھی شعر و سخن سے لگاؤ رکھنے والے لوگ موجود رہے ہیں اور گزشتہ نصف صدی سے تو کویتی نوجوانوں نے بالخصوص ادبیات اور علومِ عصریہ کی طرف پوری توجہ دی ہے۔ اس عرصے میں عربی کے بعض نامور ادبا و شعرا نے اس سرزمین میں جنم لیا، جن پر کویت کے لوگوں کو بجا طور پر فخر ہے۔ کویت میں فطری استعداد و ذکا کی کوئی کمی نہیں رہی۔ البتہ حالات و واقعاتِ زمانہ نے اسے ابھرنے اور پنپنے کا زیادہ موقع نہیں دیا۔

مشہور ادبا و شعرا

کویتی ادبا کا سرخیل فاضل ادیب السید ہاشم الرفاعی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہاشم الرفاعی ترکِ وطن کرکے بغداد چلے گئے تھے۔ جہاں وہ مدت تک بعض چوٹی کے جرائد و مجلات میں مضامین لکھتے رہے۔ اور اپنے عراقی قارئین سے داد و تحسین کے حق دار ٹھہرے۔ انھوں نے بعد میں "الصراحة" کے نام سے اپنا مستقل پرچہ بھی جاری کیا۔

صقر بن سالم الشبیب

شعرائے کویت کی صفِ اول میں سب سے پہلے الشیخ صقر بن سالم الشبیب کا نام آتا ہے۔ جو "شاعرالکویت" کے لقب سے مشہور رہیں۔ ان کا کلام عراق کے اخبارات و رسائل کی زینت بنتا رہا اور ان کی بعض قابلِ قدر نظمیں مجلہ "المرأة الجدیدة" کے صفحات کی رونق کا باعث بنیں۔ صقر الشبیب کا کلام قارئین کو بہت متاثر کرتا ہے۔

صقر ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی صرف سات سال کے تھے۔ کہ بینائی سے محروم ہوگئے۔ پھر چند ہی سال بعد ان کے والدین راہی ملکِ بقا ہوئے اور صقر تنہا رہ گئے۔ اب ان کی پرورش کا بار ان کے چچا کے کندھوں پر آپڑا۔

صقر نے سب سے پہلے قرآنِ حکیم حفظ کیا اور پھر زبان دانی اور دینی علوم کی تحصیل کے لیے انھیں احساء بھیج دیا گیا۔ جہاں انھوں نے قدما کے کلام کا وافر حصہ ذہن نشین کیا۔ جو ان کے شعری ملکہ کو جلا دینے میں ممد ثابت ہوا۔ بیس سال کی عمر میں وہ کویت واپس آگئے اور مساجد میں درس و وعظ دینے لگے۔

اگرچہ ادبیات میں صقر الشبیب کا میلان زیادہ تر قدیم اصناف کی طرف تھا مگر انھوں نے ادبِ جدید کی طرف بھی توجہ دی۔ اور جدید شعرا کے کلام کا مطالعہ بھی کیا۔ انھیں ابوالعلا المعری کی شاعری اور نظریات سے بڑی دلچسپی تھی۔ المعری بھی تو ان کی طرح بصارت سے محروم تھا۔ صقر نے المعری کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ لیکن المعری نے "کسی جان پر ظلم" کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ اور اسی لیے وہ زندگی بھر مجرد رہا۔ اس کے برعکس صقر نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں مگر اولاد سے محروم رہے۔

یہ وہ دور تھا جب کویت میں ادبی و علمی زندگی کا نیا نیا چرچا تھا۔ تعلیم گاہیں تعمیر کی جارہی تھیں۔ اور لوگوں میں دولتِ علم سے دامن بھر لینے کی جدوجہد کا آغاز ہو رہا تھا۔ اہلِ علم کو مصر اور دوسرے عرب ممالک میں زندگی کے مختلف اسالیب کا مطالعہ کرنے کے لیے روانہ کیے جانے کے علاوہ ان ممالک سے وہاں کے علما اور مفکرین کو بھی کویت آنے کی دعوت دی جاتی تھی چنانچہ سید رشید رضا، حافظ وہبہ، محمد الشنقیطی اور تونسی رہنما عبدالعزیز الثعالبی نے اسی زمانے میں کویت کی سرزمین کو اپنی آمد سے نوازا۔ علم و فضل کے ان درخشندہ ستاروں کی آمد سے کویت میں گویا زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا گیا۔ اور ادب و شعر کے شائقین نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔ صقر الشبیب بھی اس علمی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور انھوں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

کویت کے حکمران خاندان آل الصباح میں سے الشیخ سالم نے صقر کو اپنی خاص توجہات

سے نوزا۔ اسے درباری شاعر کا مرتبہ بخشا اور اس پر اس قدر نوازشات کیں کہ وہ ماضی کے مصائب و آلام کو بھول گیا۔ صقر نے بھی شیخ سالم کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھا۔ اور اس کے لطف و کرم کے گن گاتا رہا اسس نے شیخ کی مدح میں بعض غیر فانی قصیدے بھی لکھے۔

صقر بہت پُر گو شاعر تھا۔ اس کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار سے متجاوز ہے۔ کثرتِ شعر گوئی کی وجہ سے اس کے کلام میں ضعف اور تکلف بھی پایا جاتا ہے اور کبھی کبھی وہ جملۂ معترضہ اور ضرورتِ شعری کا استعمال بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ صقر کے عمدہ اور چیدہ اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور کویت کی تاریخ میں اس کو ایک ممتاز علمی شخصیت کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کا اسلوبِ نگارش سہل ممتنع کی حدود کو چھوتا ہے۔ اس کا دیوان اس کی وفات کے بعد استاذ احمد البشر الرومی نے شائع کیا جو اس کا بہت قریبی دوست تھا۔ صقر کا کلام تقریباً تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ مدح، رثاء، ہجا، غزل، شکوۂ دوراں، وعظ و نصیحت کے علاوہ اس کے کلام میں کویت کی قومی اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جھلک بھی ملتی ہے۔

صقر نے بہت سی قومی شخصیتوں کی مدح سرائی کی ہے۔ صاحب الدولہ السید طالب پاشا النقیب جب ۱۳۳۴ھ میں کویت کے دورے پر آئے تو ان کے اعزاز میں ایک ادبی محفل منعقد کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ صقر نے اس موقعہ کے لیے مدحیہ قصیدہ لکھا۔ بطورِ نمونہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

مَا فِي العراق بشمس فضلك منكرٌ — انی وقد سمقت تنیر فتبهر
شمس من الفضل المبين قد اهتدى — لضيائها مذ اشرقت من يبصر

ترجمہ: عراق میں تیرے فضل و کرم کے آفتاب کا کوئی منکر نہیں ہے۔ وہ تو بہت بلندی پر ہے: اور دنیا کو منور کر رہا ہے۔ علم و فضل کا یہ آفتاب جب سے چمک رہا ہے جو شخص بھی اس کی طرف دیکھتا ہے، اس کے نور اور اس کی روشنی کے طفیل سیدھے راستے پر چلتا ہے۔

رثاء میں بھی صقر نے قدما ہی کی پیروی کی۔ اس کے ہاں جذبے کی گہرائی اور غم و حزن کی حرارت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

فلو طلبت منّا المنيّةُ فديةً — فديتُ بنفسي ذلك العالمَ الحرّا

ترجمہ: اگر موت ہم سے کوئی جذیہ طلب کرتی تو میں اس آزاد فطرت عالم پر اپنی جان قربان کر دیتا۔

صقر نے صرف انھیں لوگوں کے مرثیے کہے جو حقیقتاً اس کے اہل تھے۔ یعنی کویت کے بعض معزز شرفا جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس کے وطن کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔

صقر ضرورت پڑنے پر ہجو بھی کہہ لیتا تھا۔ اس کے دو چار ہجویہ اشعار بھی سنیے۔

وتندم حین لا ندم مفید · و تعلم ان صقرا کان صقرا

و ان مخالبی کانت حدادا · و انی منک بالصدمات ادری

ألین لمن یلاینی و اعدو · کأصلب منبعة ان رمت کسرا

لقد اسمعتنی قولاً غلیظاً · و ما اسلفت قط الیک شرا

ترجمہ:۔ اور تو اظہارِ ندامت کر رہا ہے، جب کہ ندامت کا کوئی فائدہ نہیں اور تو جانتا ہے کہ صقر (شاہین) صقر ہی ہے اور تجھے معلوم ہے کہ میرے پنجے بہت تیز ہیں اور میں تیری نسبت صدمات کو زیادہ جانتا ہوں۔ میں ہر اس شخص کے ساتھ شرافت اور نرمی سے پیش آتا ہوں، جو میرے ساتھ شرافت کا برتاؤ کرے۔ لیکن اگر مجھے توڑنے کی کوشش کی جائے تو میں بہت سخت نیزہ بن جاتا ہوں۔ تو نے مجھے ناگوار بات سنائی ہے حالانکہ میں نے تیرے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی۔

بینائی سے محروم انسان ــ اور وہ بھی ایک حساس شاعر ــ جو خود کوئی جرم کرنے پر قادر نہیں، کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا، کسی سے ظلم کا برتاؤ نہیں کرتا، قدم قدم پر دوسروں کا محتاج ہے۔ شکوۂ دوراں کا حق دار اس سے بڑھ کر اور کون ہوگا۔ صقر الشبیب کی ساری شاعری میں درد و غم رچا بسا نظر آتا ہے۔ اس کے قصیدے، اس کے مرثیے، اس کے فلسفۂ زندگی، غرضیکہ ہر صنفِ سخن میں شکوہ و شکایت کا پلہ بھاری ہے۔ لیکن اس کے ذاتی حزن و ملال پر بھی تو اجتماعی درد کی گہری چھاپ لگی ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)